حکمتِ اقبال (۲۲)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ تاریخ (۲)

غلط نظریات کا منبع بھی خودی ہے

اُوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ کسی فردِ انسانی یا گروہ کا نصب العینِ حیات یا تصورِ حسن اس کے تمام اعمال و افعال کو پیدا کر کے ان کو اپنے گرد منظم کرتا ہے۔

آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ اعمال را شیرازہ بند

جب کوئی فرد یا گروہ اپنے نصب العین کو اپنی قدرتی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر چسپاں کرتا ہے اور ان کو اپنے نصب العین کے تقاضوں کے مطابق بناتا ہے تو ایک خاص نظریۂ زندگی وجود میں آتا ہے، جو اس نصب العین پر مبنی ہوتا ہے۔ اِس وقت نوعِ انسانی کی حالت یہ ہے کہ ان کے نصب العین یا تصوّراتِ حقیقت یا تصوّراتِ حسن بہت سے ہیں اور ان کی کثرت کی وجہ سے وہ بہت سی نظریاتی جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے، جن میں صرف امّتِ مسلمہ ایسی ہے جس کا نظریہ خدا کے عقیدہ پر مبنی ہے۔ لیکن بظاہر اس کی حالت ایسی نہیں جس سے ایک عام انسان یہ نتیجہ اخذ کر سکے کہ وہ نظریاتی ارتقاء کا مقصود ہوگی۔ باقی نظریاتی جماعتیں جو نہایت طاقتور ہیں، خدا کے عقیدہ سے محض بے تعلّق ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا ہی انسان کی منزلِ مقصود ہے اور تمام نظریاتی جماعتوں پر غالب آکر دنیا میں پھیل جانے والی نظریاتی جماعت خدا پرستوں کی ہی جماعت ہوگی تو یہ بے خدا نظریاتی جماعتیں کہاں سے وجود میں آگئی ہیں اور نظریاتی ارتقاء یا عمل تاریخ میں ان کا کردار کیا ہے۔ نظریاتی ارتقاء یا عمل تاریخ جو انسان کو اس کے حسن و کمال کی انتہا تک پہنچائے گا، ان جماعتوں کی موجودگی میں فی الواقع کیا صورت اختیار

© rasailojaraid.c

کرے گا اور کس طرح سے انجام پائے گا۔ اقبال کے نزدیک ان سوالات کا جواب بھی معنیٔ آدم یا انسان کی فطرت یا (اقبال کی زیادہ پسندیدہ اصطلاح کو کام میں لاتے ہوئے) انسانی خودی کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ انسان کے اعمال وافعال سے بنتی ہے اور تمام انسانی اعمال و افعال انسان کی فطرت یا اس کی خودی کے منبع سے سرزد ہوتے ہیں لیکن انسانی خودی کے اندر خدا کی محبّت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ اور انسان کے اعمال وافعال کی صورت میں جو کچھ اس سے باہر آتا ہے، بمصداق "ازکوزہ ہماں تراود کہ دراوست" وہ خدا ہی کی محبّت کا شعوری یا غیر شعوری اظہار ہوتا ہے اور خدا ہی کی بالواسطہ یا بلا واسطہ محبّت کی ایک صحیح یا غلط عملی شکل ہوتی ہے۔

مرا از خود بروں رفتن محال است

بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

خودی کی فطرت کے تقاضے کبھی بہک جاتے ہیں اور کبھی اپنی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں لیکن انسان کی عملی زندگی میں جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ بے خدا نظریات ہوں یا باخدا نظریات' وہ سب خودی کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں اور خودی کے مدارج اور مقامات ہوتے ہیں۔ زندگی خودی کے اشاروں پر چلتی ہے اور اس کی فطرت کی ترجمانی اور تشریح کرتی ہے۔ نصب العین صحیح ہو یا غلط وہ ہر حالت میں خودی کا ہی نصب العین ہوتا ہے اور خودی کے ہی کسی مقام کا پتہ دیتا ہے۔ جو شخص خدا کا منکر ہے اور کسی غلط نصب العین سے اپنا دل لگائے ہوئے ہے وہ خودی کے ایک مقام پر ہے' اگرچہ اس کا یہ مقام نہایت ہی پست ہے اور جو شخص خدا کو مانتا ہے اور خدا کو اپنا نصب العین قرار دیئے ہوئے ہے' وہ خودی کے دوسرے مقام پر ہے' اگرچہ اس کا یہ مقام نہایت بلند اور بالا ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی خودی کے اشارات یا مطالبات کی عملی تشریح کے سوائے اور کچھ نہیں۔

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است

لا و اِلاّ از مقاماتِ خودی است

یہاں 'لا' سے مراد ہے خدا کا انکار اور غیر اللہ کا اثبات' یعنی غلط نظریات۔ اور 'اِلّا' سے مراد ہے خدا کا اثبات اور غیر اللہ کا انکار یعنی صحیح نظریۂ حیات!

d.com

خودی کے جذبۂ محبّت کی ایک خصوصیّت

خودی براہِ راست اور شعوری طور پر خدا سے محبّت کرنا چاہتی ہے لیکن خدا کی ایسی محبّت فقط کسی شخص سے یہ بات سُن لینے اور یاد رکھ لینے سے پیدا نہیں ہوتی کہ خدا تمام صفاتِ حُسن کا مالک ہے اور محبّت کے قابل ہے، بلکہ خدا کے حُسن کا ذاتی احساس کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خدا کی محبّت خدا کے ذاتی حُسن کے احساس کا ہی نام ہے اور احساس کے بغیر خدا کی محبّت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اقبال کے الفاظ میں خدا کی محبّت 'شنید' نہیں بلکہ 'دید' ہے یعنی وہی شخص خدا سے محبّت کرسکتا ہے جو خدا کے حُسن کا ذاتی احساس رکھتا ہو۔ اقبال 'شنید' کے لیے 'خبر' اور 'دید' کے لیے 'نظر' کی اصطلاحات کام میں لاتا ہے۔ عقل فقط 'خبر' مہیا کرتی ہے لیکن باخدا لوگوں کی محبّت سے اور صحیح قسم کے نظریاتی ماحول سے 'نظر' حاصل ہوتی ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اگر بدقسمتی سے خودی کا نظریاتی یا تعلیمی ماحول ایسا ہو کہ وہ خدا کی صفاتِ حُسن کے مشاہدہ میں رکاوٹ پیدا کرے اور خدا کے حُسن کے احساس کی نشوونما نہ کرسکے، تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خودی کا جذبۂ محبّت رک جائے گا اور پھر خودی کسی نصب العین کی محبّت کے بغیر ہی رہے گی ——— لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ خودی کا جذبۂ محبّت رُک نہیں سکتا بلکہ کسی اور ناقص نصب العین کو جو فرد کے علم اور احساس کی پستیوں سے مناسبت رکھتا ہو، خدا سمجھ کر اپنا لیتا ہے۔ خودی کا جذبۂ محبت ایک تیز رفتار دریا کی طرح ہے کہ جب وہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے اپنی اصلی گزرگاہ پر نہ چل سکے تو پھر رُکتا نہیں، بلکہ اپنی راہ سے ہٹ کر اُس راستہ پر بہنے لگتا ہے جو آسان یا پست ہونے کی وجہ سے اسے بہنے کا موقع دیتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک غلط سمت کی طرف چل نکلتا ہے اور راستہ میں آبادیوں کو تباہ کرتا چلا جاتا ہے۔ خودی کی محبّت کا سیلِ رواں بھی جب کسی نظریاتی یا جذباتی رکاوٹ کی وجہ سے اپنے صحیح نصب العین یعنی خدا کی طرف جو منتہائے حسن وکمال ہے، راہ نہیں پاتا تو کسی دوسرے نصب العین کی طرف بہہ نکلتا ہے، جس کی طرف وہ راہ پاسکتا ہے۔ جب

© rasailojaraid.com

کوئی انسان خدا کے حسن کا احساس نہ کر سکے تو پھر جس قدر تصوّرات اس کے دائرۂ علم میں ہوتے ہیں ان میں سے جس تصوّر کو بھی وہ اپنی سمجھ کے مطابق سب سے زیادہ حسین سمجھتا ہے اسی کو اپنے جذبۂ محبّت کو مطمئن کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر اپنا نصب العین بنا لیتا ہے۔ اگرچہ ضروری ہے کہ خدا کا تصوّر نہ ہونے کی وجہ سے وہ نصب العین حُسن و کمال کی صفات سے عاری ہو، تاہم اس طرح سے وہ اپنی محبّت کے بہاؤ کو راستہ دیتا ہے۔ اس حقیقت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال نے جو خودی یا زندگی کو ایک تیز رفتار ندی سے تشبیہہ دی ہے، وہ کس قدر موزوں ہے۔

وہ جوئے کہستان اچکتی ہوئی   اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
ذرا دیکھ اسے ساقیٔ لالہ فام   سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!

اعصابی امراض کی جڑ

اگر کوئی شخص خدا کے حُسن کے احساس سے محروم ہو اور اس کا جذبۂ محبّت کسی اور غلط نصب العین کی محبّت میں بھی اظہار نہ پا سکے، یعنی اس کے دائرۂ علم میں کوئی ایسا تصوّر موجود نہ ہو جو اس کے لیے اتنی کشش یا جاذبیت رکھتا ہو کہ وہ اس کی طرف تمام صفاتِ حُسن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر منسوب کر سکے تو وہ ہسٹریا، جنون، ذہنی مجادلہ اور ایسے ہی دوسرے ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جب تک وہ کوئی ایسا تصوّر نہ پائے جس سے وہ صحیح طور پر یا غلط طور پر مطمئن ہو اور جو اس بنا پر اس کے جذبۂ محبّت کو راستہ دے سکے، وہ بدستور ان تکالیف میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان میں خدا کی محبّت کا جذبہ اس کی بھوک یا غذا کی خواہش سے مشابہت رکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کو شدّت کی بھوک لگی ہو اور اس کو عمدہ، صحت بخش اور خوش ذائقہ غذا میسّر نہ آ سکے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ اسے جو غذا بھی مل سکے اسی سے اپنا پیٹ بھرے۔ سخت قحط کے زمانہ میں اچھے بھلے باذوق انسان درختوں کے پتّے کھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے جب کوئی انسان خدا کی معرفت سے محروم ہو تو وہ کسی ایسے نصب العین کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو غلط اور ناقص ہونے کے باوجود اس کی کم علمی اور نادانی کی وجہ سے اس کے لیے کشش کا باعث ہوتا ہے،

کیونکہ اس حالت میں اسے اپنی ایک شدید نفسیاتی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے کسی نہ کسی تصوّر کی طرف حسن منسوب کرنا پڑتا ہے، خواہ اس میں حسن کی کوئی صفت موجود ہو یا نہ ہو۔ اگر انسان کو اچھی خوراک کبھی نصیب نہ ہوئی ہو تو وہ گھٹیا خوراک ہی میں لذّت محسوس کرتا ہے۔

غلط نصبُ العین کی ناپائیداری کا سبب

جب ایک انسان خدا کے علاوہ کسی اور تصوّر کو اپنا نصب العین بناتا ہے تو وقتی طور پر اسے حسن وکمال کی انتہا سمجھتا ہے لیکن اس کی خدمت اور اطاعت کے دوران جب وہ اسے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع پاتا ہے یا جب اس کا دائرۂ علم وسیع تر ہو جاتا ہے اور اس سے بہتر اور خوب تر تصوّرات اس میں داخل ہو جاتے ہیں، تو وہ اس کے نقائص سے باخبر ہو کر اسے ترک کر دیتا ہے اور پھر کسی نئے غلط تصوّر کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اسے بھی ناقص پاتا ہے تو اسے بھی ترک کر دیتا ہے۔ وہ کسی ناقص محبوب سے محبّت نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کی فطرت کا جذبۂ محبّت ایک ایسے محبوب کے لیے بنایا گیا ہے جس کا حُسن کامل بے عیب اور لازوال ہے۔ اقبال انسانی خودی کی اس خصوصیّت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ہر نگارے کہ مرا پیشِ نظر مے آید
خوش نگاریست ولے خوشتر ازاں مے بایست

چو نظر قرار گیرد بنگارِ خوبروئے	تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد	بنگاہِ ناشکیبے بدلِ امیدوارے

قرآن کی روشنی

قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ایک قصّہ میں فطرتِ انسانی کے اس پہلو کی طرف توجّہ دلائی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے متعلّق قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا نے انہیں شروع سے ہی ہدایت دے رکھی تھی اور وہ شروع سے ہی موحّد تھے۔

© rasailojaraid.com

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيۡنَ ۝
(سورۃ الانبیاء: ۵۱)

ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے سے ہی ہدایت دے رکھی تھی اور ہم اس بات کو خوب جانتے تھے

وہ چاہتے تھے کہ اپنی ستارہ پرست مشرک قوم پر یہ بات واضح کریں کہ ان کے معبود سب ناقص ہیں اور انسان کی محبّت کے لائق نہیں۔ انسان کی محبّت کے لائق صرف ایک ایسی ہستی ہی ہوسکتی ہے جس کے حسُن کی کوئی حد نہ ہو، جو ہر نقص سے مبرّا اور ہر عیب سے پاک ہو۔ ایسا معبود سوائے خالقِ ارض و سما کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی قوم کو مؤثّر طریق سے وعظ و نصیحت کرنے کے لیے یہ ڈھنگ اختیار کیا کہ جب ایک ستارہ کو اُفق پر چمکتے ہوئے دیکھا تو لوگوں سے کہا کہ یہ میرا ربّ ہے، کیوں کہ یہ روشن اور بلند ہے اور اس میں حسُن ہے لیکن جب وہ ڈوب گیا اور اس کے حسُن کی ناپائیداری آشکار ہوگئی تو کہا کہ میں کسی ڈوبنے والے سے محبّت نہیں کر سکتا۔ نقص اور محبّت جمع نہیں ہوسکتے (لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ - میں ڈوبنے والوں سے محبّت نہیں کرتا) پھر جب چاند نکلا تو اسے اپنا خدا بتایا کہ اس کا حسُن ہر ستارے سے بڑھ چڑھ کر ہے، لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اسے بھی ناقص قرار دے کر ترک کر دیا۔ اس کے بعد جب سورج طلوع ہوا تو کہا کہ یہ میرا ربّ ہے، کیونکہ وہ بڑا ہے اور اس کا حسُن ستارے اور چاند دونوں سے بڑھ کر ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا کہ میں ایسی ہستی کو اپنا محبوب اور معبود بناتا ہوں جو سورج، چاند اور ستاروں کا خالق ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا حسُن ان سب سے فائق ہو کہ وہ خالق ہے اور یہ سب اس کی مخلوق ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ایک انسانی فرد کے لیے کامل سے کامل تر نصب العین کے اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے ——— یہاں تک کہ وہ اس سوسائٹی کے نصب العین تک پہنچ جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور جس کا وہ ایک فرد ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی اس کے لیے ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا کر چکی ہوتی ہے کہ اس کا نصب العین اس سوسائٹی کے نصب العین سے آگے نہیں جاسکتا اور بہتر اور بلند تر نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کا نصب العین اسی صورت میں بدلتا ہے جب پوری سوسائٹی کا نصب العین بدل جائے یا جب وہ سوسائٹی سے بغاوت کر کے خود ایک نیا نصب العین پیش کرے اور لوگوں کو انقلاب کی دعوت دے۔